ب اور ادیب

پروفیسر محمد مجیب

اِنشا، ادب اور ادیب

از

پروفیسر محمد مجیب، بی، اے (آکسن)
اُستاذ جامعہ ملّیہ اِسلامیہ، دہلی

ناشر
اُردو گھر (رجسٹرڈ) دہلی

جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

جمال پریس دہلی

۱۱۰۰

قیمت فی نسخہ (۱۲)

ناشر
اُردو گھر رجسٹرڈ دہلی
احمد منزل، کلاں محل

عرضِ ناشر

پروفیسر محمد مجیب اُن میں سے ایک ہیں جو بچپن سے فرنگی دُنیا اور فرنگی ماحول میں پلے بڑھے مگر اپنی اسلامی اور ہندوستانی روح کو بے داغ بچا لائے! سنہ ۲۶ء میں ولایت سے وہ ہندوستان آئے اور سیدھے جامعہ ملّیہ پہنچے۔ اگر وہ اور بہت سے لوگوں کی طرح ہمارے ہو کر ہم میں نہ رہتے تو ہمارا ایک اور رتن غیروں کے ہاتھ پڑ جاتا، لیکن شکر ہے کہ وہ ہم ہی میں رہے اور خدا چاہے ہم ہی میں رہیں گے۔

یہ تو ہمارے فائدے کی بات ہوئی؛ خود اُنھوں نے ہم سے کیا فائدہ اُٹھایا؟ وہ اُن ہی کی زبانی سُنیئے کہ "ایک زمانہ اُن پر وہ گزرا کہ وہ اُردو بولنا اور اُردو لکھنا عار ہی نہیں اپنی کسرِ شان سمجھا کیے!" مگر جامعہ ملّیہ میں اُردو سے کیونکر بچتے یا اُردو کو حقیر کب تک سمجھتے! خدا نے کیا اُنھوں نے جامعہ میں اُردو سیکھنے کی ٹھانی۔ اپنی عام طبیعت اور مزاجی کیفیت کے

مطابق اس کام میں اُنھوں نے ایسا جی لگایا کہ اب اُردو ادیبوں میں اُن کا ایک خاص اور ممتاز درجہ ہے۔

پروفیسر محمد مجیب کے یہ دو مقالے اسی غرض سے شائع کیے جا رہے ہیں۔ پہلا مضمون طلبۂ جامعہ ملّیہ کے قلمی ماہنامہ "جوہر" کے سالنامہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مقالہ موصوف نے عربک کالج دہلی کے اُردو ہفتہ کی تقریب میں ۵ رنومبر ۱۹۴۲ء کو پڑھا تھا۔

یہ دونوں گراں قدر مضمون مجیب صاحب کی نظرِ ثانی اور اجازت کے بعد کتابی شکل میں یکجا پیش کیے جاتے ہیں۔ یقین ہے یہ کوشش مشکور ہوگی۔ ہے تو یہ مُنّی سی کتاب مگر اس میں وہ گُن بھرے ہیں جو بڑے بڑے ادبی بھی کھانوں سے بے نیاز کر دے گی۔

اُردو گھر، دہلی ۲۴ رنومبر ۱۹۴۳ء (شب)	خاکسار الیاس احمد مجیبی
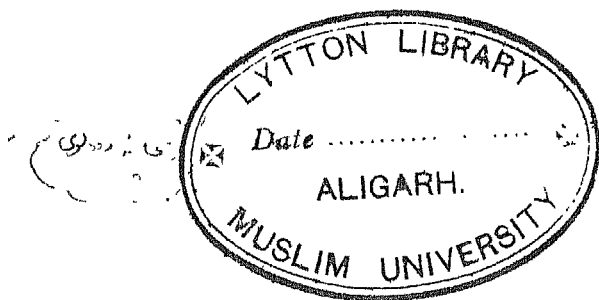
انشا پردازی کے آداب

سچی اِنشاپردازی کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی قدر کرے، دوستوں کا اصرار، کسبِ معاش کی دشواریاں کسی کو انشاپرداز نہیں بنا سکتی ہیں۔ ہمیں اس میدان میں قدم رکھنے سے پہلے یقین ہونا چاہیئے کہ جب تک ہم محنت اور مشق کے اِس فن میں مہارت نہ حاصل کریں گے، ہمیں مسرّت اور اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ اور ایک قدرتی استعداد سے فائدہ نہ اُٹھانے کا گناہ ہمارے سر ہوگا۔ انشاپردازی کا

شمار اُن عام فرائض میں نہیں ہے جو مذہب، معاشرت، یا سیاسی قانون نے مقرر کئے ہیں، وہ غرض اُسی کے لئے ہے جو اُسے انجام دینے کی اہلیت رکھتا ہو، وقت کاٹنے یا کسی کو خوش کرنے کے لئے قلم دوات سے شغل کرنا اور یہ سمجھنا کہ جہاں اور ہزاروں مضامین لکھے جاتے ہیں وہاں ایک ہمارا بھی سہی! ایسی خود فریبی ہے جس سے بہت نقصان پہنچ سکتا ہے، کیونکہ انسان مبتلا ہو کر اپنی قدر بھول جاتا ہے۔ اپنی قدر کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اپنے شوق، اپنی استعداد اور ترقی کے امکانات کا صحیح اندازہ کریں، اپنا وقت اُنھیں مشاغل میں صرف کریں جن میں ہم سمجھتے ہوں کہ ہماری محنت بارآور ہوگی اور اِدھر اُدھر بھٹکتے نہ پھریں۔ ہمیں اس کا ڈر نہ ہونا چاہئے

کہ دوسرے لوگ اعتراض کریں گے، اس لئے کہ اعتراض غلط ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ خطرہ تعریف میں ہے، خلوص اور نیک ارادے سے تعریف اور ہمّت افزائی کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں، اخلاق، مروّت یا کسی خاص غرض سے تعریف کر کے مغالطے میں ڈالنے والے ہر شخص کو مِل جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی استعداد کا اندازہ صرف دوسروں کی رائے سے نہ لگانا چاہئے۔ ہمارے جسم کے لیئے اگر کوئی غذا مفید ہو تو صحت اور مزاجی کیفیت سے یہ فائدہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ انسان اگر کسی کام کے لئے موزوں ہو تو اس کا بھی اُسے پتہ چل جاتا ہے، شرط بس یہ ہے کہ وہ اپنی حالت پر تھوڑا بہت غور کرتا رہے۔

لیکن انشاپردازی ہے کیا چیز کہ ہم اس کے پیچھے

اپنا امتحان لیتے پھریں؟ انشا پردازی دوسرے فنون
کی طرح ایک فن ہے، جس میں الفاظ سے وہی کام لیا جاتا
ہے جو مصوّری میں رنگوں اور موسیقی میں سُروں سے!
موسیقی اور مصوّری کے لئے قدرتی استعداد لازمی
سمجھی جاتی ہے، انشا پردازی میں اس کا ہونا ناگزیر نہیں
معلوم ہوتا اس لئے کہ ہم بول چال، کاروباری تحریروں
اور علمی مضامین میں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو
انشا پرداز کے فن کا سامان اور سرمایہ ہیں - انشا
پردازی کی حدبندی کرنا مشکل ہے، خصوصاً جب ہم
ہر تعلیم یافتہ آدمی سے توقع کرتے ہیں کہ وہ گفتگو اور تحریر
میں اپنا مطلب خوبی اور وضاحت کے ساتھ ادا کرسکے
لیکن جس زمانے میں صحیح اور مکمل تعلیم کا تصوّر لوگوں کے

ذہن میں تھا ہر نوجوان کو زبان اور نظری علوم کے علاوہ موسیقی، مصوّری، سپہ گری کے مختلف شعبوں اور چند صنعتوں میں اچھا مذاق اور معقول رائے رکھنے کا اہل بنانے کی کوشش کی جاتی تھی، اور پھر بھی یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اُسے تمام علوم و فنون میں یکساں ملکہ حاصل ہو جائے گا۔ ملکہ اور مہارت حاصل کرنا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کا کام تھا، اُس وقت کا کام جب نوجوان کو اپنے ذوق اور استعداد کے متعلق غلط فہمی ہونے کا کم سے کم امکان ہوتا تھا۔ آج کل ہم نے تعلیم کو بہت محدود کر دیا ہے، زبان اور چند علوم کے سوا کچھ نہیں سکھاتے۔ اس سے بہت سے نتیجے نکلے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر شخص جو لکھ سکتا ہے انشا پرداز کہلاتا ہے، اور اگر کوئی اِس فن میں

طبع آزمائی نہیں کرتا تو ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم کے باوجود وہ کورا رہ گیا! ہم انشا پردازی کو اگر ایک فن مانتے تو اس کے آداب بھی معین کرتے، اب وہ ایک ایسی دولت ہے جسے تعلیم گاہیں اور رسالے بے دھڑک لٹاتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص قدر نہیں ہے، اور اسی سبب سے ہم میں سچے انشا پرداز بھی نہیں ہیں!

میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو لکھنا پڑھنا چھوڑ دینا چاہیے۔ میرا مقصد صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ انشا پردازی ایک فن ہے، ایسا فن جسے سیکھے بغیر ہم اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ مگر ایسا فن جس کو ترقی اُسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم اُس کا احترام کریں اور اُس کے آداب سے واقف ہوں۔ اگر ہم بغیر اپنی استعداد

کو آزمانے پر سمجھ لیں گے کہ ہم اس فن میں کامل نہیں تو ماہر ہو سکتے ہیں تو دھوکا کھائیں گے لیکن اگر ہم دھوکا کھانے کے ڈر میں اپنی استعداد کو نظر انداز کریں گے تو ہمیں انسان بننا نصیب نہ ہوگا۔ انشاپرداز ہونا ہمارا فرض نہیں ہے، انشاپردازی کے آداب سے واقف ہونا ہماری ذہنی نشو و نما کے لئے لازمی ہے۔

انشاپردازی کی قدر اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم الفاظ کی قدر کریں۔ بدقسمتی سے ہماری زبان کئی زبانوں کا مرکب ہے جن میں سے کوئی ہم تک براہ راست نہیں پہونچی۔ عربی ہم نے عربوں اور قرآن پاک سے نہیں سیکھی بلکہ دیسی علمائے دین سے، فارسی میں ہم نے سعدی رح اور حافظ رح کو اپنا معیار نہیں بنایا بلکہ خاقانی اور علامی

ابوالفضل کو ہندی کی سرپرستی ہم نے اُن لوگوں کے سپرد
کردی جن کے ذہن اور جذبات کو اشتغال دینے کے
لئے فارسی کی رنگیلی غزلیں کافی نہیں تھیں، فصاحت اور
بلاغت کا جو معیار ہمیں ورثے میں ملا ہے وہ سیانے سے
سیانے کو بہکا سکتا ہے! علم کے لئے عربی، ادب کے لئے
فارسی، ایک خاص قسم کی بناوٹی سادگی کے لئے ہندی
الفاظ مخصوص کر دیئے گئے ہیں، چاہے ان کے معنے
میں خاص فرق نہ ہو اور ایک کی جگہ دوسرا استعمال کیا
جا سکتا ہو۔ آج کل بد مذاقی کے سبب سے فارسی اور
تعصب کی وجہ سے ہندی الفاظ کی ساکھ جاتی رہی ہے!
بس ایک خاص قسم کی عربی رائج ہو گئی ہے جسے اسلامی
کہئے تو کہئے۔ زبان کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم نہ پرانے

علامی ابو الفضل والے معیار پر پورے اُترتے ہیں نہ آج کل
کے قومی معیار پر، اصطلاحوں کے نام سے جو لوگ عربی الفاظ
لکھ مارتے ہیں وہ اکثر عربی نہیں جانتے ، ایسی اصطلاحیں
بہت کم ہیں جن کا مفہوم جلی ہو چکا ہو مگر ہم صرف اُس
ہندی سے نہیں جو کہ اب " بھارت ماتا " کی بولی ٹھیرائی
جا رہی ہو بلکہ اُس ہندی سے جسے ہم نے دیہات سے
لاکر شہر اور دربار میں رونق افروز کیا دور ہوتے چلے
جا رہے ہیں ۔ محاورے دہلی اور لکھنؤ والوں کے چوچلے
بن کر رہ گئے ہیں ۔ قواعد کا خیال کون کرے جب ہر جملہ
کسی انگریزی جملہ کا ترجمہ ہوتا ہو اور کوئی زبان پر اعتراض
کرتا ہو تو فوراً دھمکی دی جاتی ہو کہ چپ رہو نہیں تو ہم پنجابی
یا بنگالی بولنے لگیں گے اور تم اپنے قواعد لئے بیٹھے رہ جاؤ گے ۔

ایسی دھمکی دینے والے سب کے سب جھگڑالو یا ناشائستہ نہیں ہوتے۔ عام طور سے یہ لوگ وہ ہیں جن کے یہاں اُردو کو رواج پاتے چالیس پچاس سال ہوئے ہیں اور ان کے علم اور ادبی مذاق کی بنیاد پختہ نہیں ہے کیونکہ نئے طرز تعلیم میں کہیں بھی پختگی نظر نہیں آتی! جو لوگ زبان داں بن کر اُن پر اعتراض کرتے ہیں ان میں بھی زبان کی سچّی قدر شناسی کے بہت کم آثار ملتے ہیں؛ کیونکہ انھوں نے موضوع، خیال اور انسانی شخصیت سے بالکل جُدا زبان کی حیثیت قائم کی ہے۔ عبارت میں محاورے بندش اور خدا جانے کیا کیا تلاش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ زبان کا مقصد خیالات کو ادا کرنا ہے، اور جب تک زبان پر تنقید کرتے وقت موضوع خیالات اور

لکھنے والے کے مذاق اور حالات پر یکساں نظر نہ ڈالی جائے، نقاد کی رائے کبھی صحیح ہو ہی نہیں سکتی۔

لیکن ہمیں ان جھگڑوں میں نہ پڑنا چاہیئے بلکہ یہ سمجھ کر کہ ہماری زبان ایک عزیز سرمایہ ہے جو ہمیں ورثے میں ملا ہے اور جسے شاعری اور افسانہ نویسی کے علاوہ اپنے علم، فن اور کاروبار کے لئے کارآمد بنانا ہمارا فرض ہے، اپنے آپ کو اس فرض کی انجام دہی کے لائق بنانا ہے، اس وقت یہی ایک فرض ہمارے ذمّے نہیں ہے، ہم کو ایک زندگی، ایک دنیا بنا کر کھڑی کرنا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اپنی سیرت بھی تعمیر کرنا ہے، کہ ہم نئی زندگی کا بار اُٹھا سکیں، یعنی ادبی مسائل اور خاص طور سے انشا پردازی کے آداب پر غور کرتے ہوئے ہم کو اپنی ذہنی تربیت اور

اپنے مقاصد بھی مدِ نظر رکھنا چاہئیں، فصاحت اور بلاغت کا پرانا معیار اب ہمارے کام نہیں آسکتا! اس سبب سے نہیں کہ وہ معیار غلط تھا بلکہ اس سبب سے کہ اب ہماری تعلیم اور تربیت کا اصول بدل گیا ہے اور ہمارے ذہن پر ایسے اثرات پڑ رہے ہیں جن سے پرانے اُستادوں کو سابقہ نہیں پڑتا تھا، پرانی انشا پردازی کسی کسی کے لئے فن تھی مگر زیادہ تر ایک صنعت ہو گئی تھی، اس وقت وہ صرف ایک فن ہو سکتی ہے کیونکہ صنعت کی حیثیت سے وہ اس زمانے کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی۔

تربیت کے نقطۂ نظر سے فن اور صنعت میں کوئی اصولی فرق نہیں۔ صنعت فن کی وہ شکل ہے جو عام تعلیم کا جزو ہو اور اُستاد سے شاگرد تک پہنچائی جا سکے،

ڈرائنگ ایک صفت ہی، وہ مصوّری جس میں خیالات
اور احساسات کو نقش اور رنگ کی پوشاک دی جاتی
فن ہی۔ ڈرائنگ کی تعلیم اسکول میں ہر طالب علم کو دی
جا سکتی ہی، مصوّر صرف وہی ہو سکتا ہی جس میں قدرتی
استعداد ہو۔ اسی طرح زبان کی تعلیم ہر نوجوان کو دی جاتی
ہی، انشا پرداز وہی ہو سکتا ہی جس میں اس کی اہلیت ہو۔
لیکن جیسے ڈرائنگ سیکھے بغیر مصوّر ہونا مشکل ہی، انشا
پردازی کے فن میں کمال اُسی کو نصیب ہوگا جس نے
فن کو قاعدے سے اور ایک ناگزیر صنعت سمجھ کر سیکھا ہو
آج کل کی زندگی کا رنگ ایسا ہی کہ ہم انشا پردازی کو ایک
صنعت مان کر اس کو حاصل کرنے کے لیے اتنا وقت صرف
نہیں کر سکتے جتنا کہ اگلے زمانے کے لوگ کرتے تھے لیکن

ہماری تعلیم گاہوں کو چاہیئے کہ طالب علموں کو زبان اور انشا پردازی کے فن کا احترام کرنا سکھائیں اور غلطی یا زیادہ بے پروائی پر ٹوکیں۔ کیونکہ بے پروائی بے ادبی کا دوسرا نام ہے! ہمارے بزرگ اور استاد علی محمد خاں صاحب[1] جو اپنے فن میں کامل ہیں ہمیشہ وضو کرکے لکھنے بیٹھتے ہیں! ہمیں انشاپردازی کی صنعت اور فن کا بھی اسی طرح احترام کرنا چاہیئے، ہمیں غلطیوں سے بچنا چاہیئے، اس لیئے کہ وہ دوسروں کی نظروں میں ہماری قدر کم کردیتی ہیں، اور

---

[1] زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا؛ کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے
پروفیسر مجیب نے منشی جی مرحوم کا نام لے کر ایک دبی ہوئی چنگاری کو اکھیڑ دیا
جی چاہتا ہے منشی جی مرحوم پر ایک کتاب لکھ سکوں تو لکھ دوں۔ یہاں زیادہ کچھ
کہنے کا موقع نہیں، پھر بھی مجیب صاحب کے گلبدن میں بے اختیار (باقی ص ۲۱)

غلط فہمیوں سے بھی خبردار رہنا چاہیئے، کیونکہ وہ ہمیں گمراہ کردیتی ہیں۔ ادبی دنیا عملی دنیا سے جدا چیز نہیں۔ دونوں میں سلامت روی اور ترقی کے اصول ایک سے ہیں۔

اگر ہم یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ انشا پرداز بننا ہمارا فرض نہیں ہو تو کم از کم شروع میں ہم اس فضول محنت سے بچ جائیں گے جو ادبی بلند پروازیوں میں صرف ہوتی ہو، اور

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۰) اپنے ٹاٹ کا جو پیوند لگانے لگا ہوں وہ بھی شاید انہی کے مفہوم کو اور واضح کرے گا۔ توقع ہو کہ یہ دخل در معقولات گراں بارِ خاطر نہ ہوگا۔

مرحوم فرخ آباد (یو، پی) کے باشندے تھے، دہلی میں کبھی کتابت کو ذریعۂ معاش بنالیا تھا، بزرگوں سے مصوری اور خوشنویسی ورثے میں پائی تھی، طبیعت کا اصلی رنگ مذہبی تھا اس لیے مصوری شروع ہی سے ترک کردی تھی، زیادہ مطبع مجتبائی میں کتابت اور معکوس نویسی کرتے تھے اور خاصا کما لیتے تھے مگر واہ ری دیانت اور سچائی! واہ رے شوق اور فن کی لگن! جس نے (باقی صفحہ ۲۲)

نفاست، فصاحت اور بلاغت کی جگہ ہمارے مدِنظر بس
سیدھا سادا مقصد ہوگا، کہ اپنا مطلب صحیح صحیح ادا کر دیں
مطلب کو صحیح ادا کرنا ایسا آسان نہیں ہے جیسا کہ بظا
معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ الفاظ کے جال میں صرف وہ
نہیں اُلجھتے جو بلند پروازی کا حوصلہ کرتے ہیں، بلکہ وہ لوگ
بھی جو اس قدر سادگی پسند ہوتے ہیں کہ خیال کو ادا کر

(باقی صا۲۱) بہت جلد حقیقت کا پردہ اُٹھا کے چھوڑا! سب کچھ چھوڑ سیدھے رآم
پہنچے، پھر رقم مرحوم کے شاگرد ہوئے - وہ بھی ایک کہانی ہے! پھر جیسی شاگ
کی، آج وہ بھی کہانی سمجھی جاتی گی، بھلا کس کا پتّا ہے جو اچھّا خاصا کاتب
بیس برس کا بل اُستاد کی جوتیاں سیدھی کرے! خدا مغفرت کرے منشی علی حم
نے اس شان کی شاگردی کی! آج بڑے بڑے اُستادوں میں (خواہ وہ کس
فن کے ہوں، خوشنویس تو اب مٹتے ہی جاتے) یہ ثبات و استقامت
اور یہ خلوص اور لگن عنقا ہے۔ منشی جی مرحوم بہت خوش اوقات، (باقی صہ

ے لئے مناسب الفاظ تلاش ہی نہیں کرتے ، دراصل اگر
ہ اس بظاہر معمولی سی کوشش میں لگے رہیں کہ اپنے
لات کو بالکل صحیح ادا کریں اور عبارت سلجھی ہوئی رہے،
م انشا پردازی میں کامل ہو سکتے ہیں کیونکہ اس سے ہم کو
نے ذہن اور اپنی زبان پر وہ قابو ہو جائے گا جو رنگین
ج اور لطافت پسند انشا پردازوں کو بہت کم ہوتا ہے۔

حاشیہ صفحہ ۲۲) تہجد گزار بزرگ تھے ، فجر کی نماز کے بعد ریاض بلکہ عبادت کے
ہمیشہ مشق کیا کرتے ۔ ایسے مخلص اہل فن لوگوں کے لیے اب آنکھیں ترستی
پھر بھی خدا کے بندوں سے خدا کی خدائی کبھی خالی بھی نہیں رہی ۔

محترمی منشی نصیر الدین احمد صاحب انصاری (جنھوں نے یہ رسالہ
ی کی خصوصیات بھی کچھ یہی ہیں ۔ دین دار ، متدین ، مخلص ، یار باش
مزاج ، کھلنڈرے بھی ، کام کے دیوانے بھی ؛ دھن سوار ہو گئی تو پوری
رات بیت گئی ؛ عشا کے وضو سے فجر پڑھی ؛ لکھ رہے ہیں ، (باقی صفحہ ۲۴)

ہندوستان میں اس وقت سب سے اچھی اور موثر انگریزی مہاتما گاندھی لکھتے ہیں، اگرچہ اُنھوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ نہیں کیا ہی، وہ سچ بولنا چاہتے ہیں، لکھتے وقت ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کے خیال اور ان کے بیان میں بال برابر فرق نہ ہو، اور ان کی زبان اتنی صاف ستھری، ان کا مطلب اتنا واضح ہوتا ہے کہ اہل زبان بھی اُن پر رشک کر سکتے ہیں!

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳) چاٹتے پی رہے ہیں! ۱۹۲۲ء سے مجھے اس قسم کے کاموں سے واسطہ ہی مگر بس یا تو منشی علی محمد خاں مرحوم کو دیکھا یا منشی نصیر الدین صاحب کو! دیکھ دیکھ سبق ملتا ہی اور سمجھ میں آتا ہی کہ جب تک یہ سب باتیں نہ ہوں فن نہیں آتا! یوں پیٹ پالنے والوں یا دنیا کو دھوکا دینے والوں کی کیا کمی ہی!

(مجیبی، مرتب و ناشر)

اپنی اور اپنی زبان کی قدر کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اپنے خیالات کی بھی قدر کریں - جب کچھ کہنا نہ ہو تو خاموش رہو - ایک پُرانا اور نہایت مفید اصول ہی لیکن یہ خاموشی انسان کی خاموشی ہونا چاہیئے ؛ حیوان کی بے زبانی نہ ہو ! اور خاموشی کی توفیق اُسی کو ہو سکتی ہی جو اپنے اور دوسروں کے خیالات کو سمجھے اور اُن کی قدر پہچانے - ہر خیال کسی عبارت میں بہترین طریقے پر ادا ہو سکتا ہی - جیسے حُسن کسی خاص پوشاک میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہی؛ خیال اور الفاظ کی موزونیت کا اندازہ آہستہ آہستہ عمر، تجربے اور مذاق کی نشوونما کے ساتھ ہوتا ہی لیکن اگر ہم اس کا لحاظ رکھیں کہ جب تک مناسب الفاظ نہ مل جائیں خیالات کو ذہن سے باہر قدم نہ رکھنا چاہیئے ؛ تو ہمیں اپنی زبان کی

صحت اور مناسبت کا صحیح اندازہ بہت جلد ہو جائے گا۔

اس حقیقت کو کہ زبان دراصل خیالات ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے نظر انداز کرنے سے ہمارے ادب میں بہت سے عیب پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم کسی کی صورت یا سیرت، اپنے یا پرائے دل کی کیفیت یا کسی منظر کی خوبیوں کا نقشہ کھینچنا چاہیں، یا کسی اور کے کھینچے ہوئے نقشے کو غور سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم بہت سے اسم صفت جمع کر دیتے ہیں جس میں سے کسی ایک کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور نہ ہم بڑائی کرتے ہیں کوئی اندازہ قائم رکھ سکتے ہیں نہ بُرائی کرتے ہیں۔ لیکن ہماری زبان میں خصوصاً اگر ہم اُسے عربی، فارسی اور ہندی کا ایک قدرتی مرکب سمجھیں الفاظ کا اتنا ذخیرہ ہے کہ ہم ہر مطلب صحیح ادا کر سکتے ہیں

اور مبالغے سے بچ سکتے ہیں۔ غلطی دراصل ہماری ہے کہ ہم
الفاظ کی چھان بین نہیں کرتے ہر اچھی چیز کو دل فریب، اور
ہر بری چیز کو "ناگفتہ بہ" کہہ کر بات ٹال دیتے ہیں، اور
مضمون چھپ جاتا ہے۔ اس سے ایک طرف یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ ہم اپنے خیالات کی قدر نہیں کرتے اور دوسری طرف
یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں سچی بات کہنے کا شوق نہیں ہے۔ ہمیں
لکھنے سے مطلب ہے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، اس سے ہمیں
سروکار نہیں۔

انشاپردازی ایک فن ہے، اور فن اسی وقت وجود میں
آتا ہے جب اس کو کوئی شخصیت اپنے اظہار کا ذریعہ بنائے!
انشاپرداز بننے کی پہلی شرط ادبی تعلیم و تربیت نہیں بلکہ
شخصیت کی تعمیر ہے، یعنی ان اصولوں کی پیروی، جو اخلاقی

تربیت کے لئے لازمی مانے جاتے ہیں۔ ادبی اوصاف اخلاقی
اوصاف سے جدا نہیں ہیں! اگر ہم سے ان کی تفصیل پوچھی
جائے تو ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ سوا اس کے کہ صنّاع اور
اخلاقی معلّم کی طرح ادیب کو سچّا، ایمان دار، مخلص، متین اور
خوددار ہونا چاہئے! اگر اس کی شخصیت میں اتنی قوت اور
اتنا زور ہونا چاہئے کہ زبان کو اپنے رنگ میں رنگ دے
اور الفاظ کی بے حس مٹّی میں جان ڈال دے!۔

ادب اور ادیب کا مقصد

ہمارے زمانے کے عجائبات میں سے ایک بہت ہی عجیب چیز ہی یہ مقصد کی بحث ہی! جس وقت سے ہمیں کچھ شعور ہوتا ہی ہم ہر چیز کا، ہر کام کا، ہر خیال کا مقصد پوچھنے لگتے ہیں۔ جب تک ہم میں غور کرنے کی صلاحیت رہتی ہی ہم مقصد کی جستجو میں رہتے ہیں اور جب خود مایوس ہو جاتے ہیں تو دوسروں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ وہ کچھ معلوم کریں اور ہمیں بتائیں۔ کسی مقصد کے ہاتھ نہ لگنے سے ہمارے بڑے بوڑھے چڑچڑے

اور بدگمان ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نوجوان درخواستیں لکھتے
اور سفارشیں کراتے پھرتے ہیں اور ہماری جماعت میں ایک
ایسا انتشار پیدا ہو گیا ہے جسے شاید اب مقصد کا صحیح علم بھی
دور نہ کر سکے گا۔ لطف تو یہ ہے کہ وہی چند لوگ جنھوں نے اپنے
نزدیک زندگی کا ایک مقصد معلوم کر لیا ہے پریشانی میں اور
زیادہ پریشان کرتے ہیں۔ ان مقصد کا علم رکھنے والوں میں
ایک گروہ وہ ہے جو زندگی کے اسلامی طریقہ کو صحیح طریقہ مانتا ہے
اور معاشرت، تہذیب اور سیاست کو اس ایک رنگ میں
رنگ دینا چاہتا ہے۔ اسلامی طریقے کو برتنے سے کسی مسلمان
کو انکار نہ کرنا چاہیے لیکن ابھی تک اس کے مبلغوں میں
ایسے نمونے نظر نہیں آئے جن کی تقلید کی جا سکے۔ گویا رنگ
موجود ہیں، رنگنے کو سطح موجود ہے، رنگریز تیار کھڑے ہیں

پس اس کی ضرورت ہے کہ وہ آپس میں طے کرلیں کہ کونسا رنگ اسلامی ہوگا، کونسا نہ ہوگا۔ ان کی بحثیں ہمیں اس دبدھے میں ڈال دیتی ہیں کہ اسلامی رنگ استعارہ ہے یا واقعی کوئی رنگ! اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم پھر مقصد کے پھیر میں پڑ جاتے ہیں۔ دوسرا گروہ اس کے صحیح علم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے وہ ہے جس کے نزدیک ہر مشکل کا حل انقلاب ہے! بعض لوگ تو انقلاب کے ایسے گرویدہ ہیں کہ وہ اسی کو ایک مقصد سمجھے بیٹھے ہیں اور اس لفظ میں کچھ ایسی شان ہے کہ لغت میں اس کے معنیٰ دیکھنا نئی زندگی کی توہین معلوم ہوتی ہے انقلاب کی صدا لگانے والے بہت ہیں اور ان میں ان چند لوگوں کی آواز گم ہوجاتی ہے جو جانتے ہیں کہ انقلاب محض ایک ذریعہ ہے! اور وہ اسی وقت توجہ کے قابل ہوا ہے جبکہ

وہ اشتراکی نظام کا پیش خیمہ ہو! اشتراکی نظام کا تصور اصطلاحوں اور سیاسی فرقہ بندیوں میں اُلجھ نہ گیا ہوتا تو وہ ایک مقصد بن سکتا تھا۔ فی الحال اس بحث سے نجات ملنے کی صورت نہیں ہو کہ اُسے تسلیم کرنے کے بعد بھی صحیح مقصد اور صحیح طریقہ کی جستجو کا فرض باقی رہتا ہو۔

لیکن ہم ہیں کہ مقصد کی فکر میں سرگردانی پر مجبور ہیں معلوم نہیں یہ بیداری کی علامت ہو یا غفلت کی! ترقی کی یا انحطاط کی! بظاہر تو مقصد کے آرزومندوں کی کیفیت ان لوگوں سے ملتی ہو جو طبیبوں سے لمبے مشورے کرتے ہیں، گھنٹوں نبض پر ہاتھ رکھ کر اور معدے اور جگر کے فعل پر دھیان جما کر بیٹھتے ہیں کہ تندرست ہونے کا مقصد حاصل کرلیں! وہ لوگ جو زندگی کے مقصد کو زندگی سے ایک الگ چیز سمجھتے ہیں، اپنے آپ سے

اور دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہونا
چاہیئے یا اس پر غور کرتے ہیں کہ وہ کسی بڑے مقصد کو پورا
کر رہے ہیں یا نہیں؟ در اصل ایک قدرتاً مکمل چیز کو توڑ کر پھر
بنانا چاہتے ہیں اور اُن کے منتشر افکار کا مسالہ زندگی کے
اجزا کو جوڑ نہیں سکتا۔ زندگی کا تجزیہ کرنے والوں کو اعصاب
کے مریضوں کی طرح اپنی ذات، اپنی دشواریاں اور اپنے
مسائل بالکل ہی نرالے معلوم ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے
وہ اپنی زندگی کے لئے ایک مقصد چاہتے ہیں جو خاص
ان کا مقصد ٹھہرایا جا سکے۔ ان میں ایسی انفرادیت پیدا
ہو جاتی ہی جو صرف اپنی ذات کو حقیقی سمجھتی ہی۔ جو بنتے بنتے
کائنات کا مرکز بن جاتی ہی۔ اس کے لیے یہ سوال محض
ضمنی ہو جاتا ہی کہ دنیا کو کس نے بنایا، وہ خدا سے پوچھنا

چاہتی ہے کہ وہ کس طرح وجود میں آیا۔ اس کے نزدیک یہ
کوئی نامناسب بات نہیں کہ کائنات کے سارے کام
بند تصوّر کیے جائیں جب تک کہ یہ طے نہ ہو جائے کہ اس
کاروبار میں اس کا کتنا حصّہ ہے، کتنے کام اس کے بنانے
سے بن جائیں گے اور بگاڑنے سے بگڑ جائیں گے! ایسی
انفرادیت کسی مقصد، کسی فن، میراجی چاہتا ہے کہوں کہ
کسی خوبی کی بھی حامل نہیں ہو سکتی! اور اس پر ازل سے
یہ لعنت بھیجی گئی ہے کہ اپنے اوپر غور کرتی رہے۔ اپنے
لایق مقصد اور کام کو تلاش کرتی رہے اور اُسے کچھ
نصیب نہ ہو!

افسوس ہے کہ یہ انفرادیت ہمارے ملک میں ایک
وبا کی طرح پھیلی ہے اور مقاصد کی کوئی بحث اس کی

نحوست سے پاک نہیں رکھی جا سکتی۔ ہم کسی ایسے مسئلے
پر گفتگو ہی نہیں کر سکتے جس میں فیصلہ کرنا اور ایک راہ
اختیار کرنا ہمارے بس میں ہو۔ اس لئے کہ یہ انفرادیت
کسی بنیادی بات کو قبول نہیں کرتی۔ ہم اپنی محنت کے
پھلوں سے محروم رہتے ہیں اس لئے کہ جو درخت بھی
لگایا جاتا ہے اس کی جڑوں کو یہ انفرادیت کھود کھود کر
دیکھتی ہو کہ وہ زمین میں ٹھیک طرح سے پھیلی ہیں یا نہیں
ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ادب کا مقصد جی بہلانا ہو۔ اس ڈر
میں کہ وہ تمام لوگ جن کا قلم دنیا کی تقدیر لکھ رہا ہو چلا
اُٹھیں گے کہ ان کی توہین کی گئی ہے! ہم یہ نہیں کہہ سکتے
کہ ادب کا مقصد شخصیت کا اظہار کرنا ہو کیونکہ پھر ہماری دنیا
اُن بے شمار شخصیتوں کی نمایش گاہ بن جائے گی جو اس

انتظار میں بیٹھی ہیں کہ انھیں ان کا حق دیا جائے۔ ہم یہ بھی
نہیں کہہ سکتے کہ ادب کا مقصد انسان کو حُسن کا ازل کا جلوہ
دکھانا ہے اس لئے کہ ادب میں حُسن کا جلوہ آج کل عام ہے!
اور اُسے دیکھنا کوئی بات ہی نہیں۔ آپ دل میں سمجھتے
ہوں تب بھی خدا کے لئے زبان سے نہ کہیئے کہ ادب کا مقصد
جماعت کی اصلاح اور رہنمائی ہے۔ اب تو نہ جانے کتنے
ادیب ہیں جو قلم کو یہ سمجھ کر اُٹھاتے ہیں کہ زندگی کا صحیح نقشہ بنانا
ان کا خاص منصب ہے! اور ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ ادیب
کو رہنما ہونا چاہیئے تو رہنماؤں کے ہجوم میں رستہ چلنا
دشوار ہو جائے گا! اس سے تو یہی کہہ دینا بہتر ہے کہ ادب
آپ اپنا مقصد ہے! ادیب ہر قید سے آزاد ہے اور کسی کو
حق نہیں کہ اُس سے باز پرس یا حجت کرے، سوائے

دوسرے ادیبوں کے، اور خدا انہیں بھی ان کی آزادی مُبارک کرے۔

آپ میرے اس بیان سے یہ نہ سمجھیں کہ میرے دل میں ادب یا ادیبوں کی قدر نہیں، مجھے شکایت ہی تو یہ کہ ہم ادب کا اور ادیب اپنے فن کا، جیسا کہ چاہیئے احترام نہیں کرتے۔ میرے خیال میں ادب اور ادیب کے مقصد کی بحث چھڑنے اور جاری رہنے کا ایک بڑا سبب یہ ہی کہ ہم اپنے آپ کو ادب کا خادم نہیں سمجھتے، ادب کو اپنا خادم بنانا چاہتے ہیں! اور اس ظاہری اختیار سے جو ہمیں حاصل ہی کہ جو چاہیں لکھیں اور جس طرح چاہیں لکھیں دھوکا کھا کر فرض کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک ادب کو ایک نئی شکل دے سکتا ہی۔ ہمارے ادیب

اس صلاحیت کو جو انھیں قدرت کی طرف سے ملی ہے۔ کافی سمجھ کر مشق اور محنت اور کام کی جانچ کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور انھیں دو چار ہم مذاق مل جائیں تو انھیں عام رائے کی کوئی پروا نہیں رہتی۔ لیکن زبان اور ادب جماعت کی مِلک ہے! افراد کی نہیں۔ افراد کو ان کے حسب مقدور اس کا ایک حصّہ امانت کے طور پر ملتا ہے اور اُسے وہ چاہیں تو ضائع بھی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اُسے ضایع نہیں کرنا چاہتے اور اُسے اپنا خاص حق ٹھراکر جماعت کے خزانے سے الگ رکھنا نہیں چاہتے تو انھیں وہ تمام شرطیں اور پابندیاں قبول کرنا ہوں گی جو جماعت کے کاموں کو جاری رکھنے اور ترقی دینے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ انھیں زبان کو اسی طرح سیکھنا ہوگا جیسے کسی

فن کو سیکھتے ہیں۔ غلط اور صحیح ہیں اسی طرح فرق کرنا اور غلطی
سے بچنے کی فکر اسی طرح کرنا ہو گا جیسے کہ نازک آلات بنانے
والے کرتے ہیں، انھیں ان نمونوں کو جنھیں زبان جاننے
والے معیاری مانتے ہیں اسی طرح ذہن نشین کرنا ہو گا
جیسے کہ کسی علم یا فن کے بنیادی اصول ذہن نشین کیئے
جاتے ہیں اور اپنے ہر کام کو اس سختی سے جانچنا ہو گا جو
بے مروت ممتحن کا حصّہ مانی جاتی ہے۔ ریاضت کا یہ سلسلہ
تکمیل کو پہنچ جائے تب سمجھنا چاہیئے کہ شخصیت ظاہر کرنے
کا موقع آتا ہے۔ لیکن یہ شخصیت جو اب ظاہر ہو گی فن کو مٹا
کر نہیں اپنے آپ کو مٹا کر بنی ہو گی! اسے اپنی صلاحیتوں
کا صحیح اندازہ ہو گا۔ وہ ایسے ہی کام اُٹھائے گی جنھیں
انجام دے کر وہ فن کی عزّت بڑھا سکے۔ ایسے ناکام اور

گمنام رہنا گوارا ہوگا مگر وہ اپنی کسی گستاخی سے فن کو بے آبرو نہ کرے گی۔ ایسی شخصیت اپنے مقصد کے بارے میں سوال نہیں کرتی۔ اور دوسرے اُس کا مقصد معلوم کرنا چاہیں تو وہ جواب نہیں دیتی! اُسے اپنے کام سے مطلب ہوتا ہے اور اس کو بہتر سے بہتر انجام دینے سے۔ اس کا مقصد تھا کہ اپنی خاص استعداد کا پتہ چلالے اور استعداد کے مناسب کام کو سیکھ لے۔ یہ جب منشا ہو گیا تو پھر مقصد کا سوال نہیں رہتا بس استعداد دکھانے اور فن کی خدمت کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔

ہمارے ادیبوں کی تربیت اس نہج پر ہو تو بہت سی پیچیدگیاں جو اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ ادیب اپنے آپ کو فن سے برتر سمجھتے ہیں اور اپنا ہر کام دل میں یہ ٹھان کر

کرتے ہیں کہ وہ جماعت اور فن پر ایک احسان کر رہے ہیں دور ہو جائیں گی۔ یہ مقصد کی بحث بھی جو فطرت اور تہذیب کے خلاف باتیں کرایا کرتی ہے ختم ہو جائے گی اور ادیب صحیح معنوں میں آزاد ہو جائے گا۔ مگر ٹھہریئے! ہم کو ایک اچھے فلسفے نے اس غلط فہمی میں ڈال دیا ہے کہ آزادی ایک انفعالی چیز نہیں ہے۔ رکاوٹوں کے موجود نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ اس کا تعلق سیاست اور قانون سے ہے۔ انسانیت اور تہذیب سے نہیں! اب میں آپ سے یہ کیسے کہوں کہ آزاد وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے تعلیم کی ساری پابندیاں قبول کی ہوں! اپنی خاص استعداد کا صحیح اندازہ کر لیا ہو۔ جسے ایسی تربیت دی گئی ہو کہ وہ اپنی استعداد سے پورا کام لے سکے

جس کی جماعت اس کی قدر کرے اور جو فن کو ترقی دینا، جماعت کی خدمت کرنا اپنا منصب جانے۔ میرے ذہن میں آزاد ادیب کا جو تصوّر ہے وہ ایسے شخص کا ہے جسے اپنی زبان میں پورا ملکہ ہو، جو اپنے فن کے امکانات سے واقف ہو اور اس سے ایسے کام لینے کا خیال ہی نہ کرے جس کے لیے وہ موزوں نہیں۔ ایسا ادیب کبھی کبھی اپنا اور دوسروں کا جی بہلائے گا۔ اگر اُسے جی بہلانا آتا ہے۔ اپنے کام میں شخصیت کو ظاہر کرے گا اور جتنا نمایاں اُس کا کام ہوگا اتنی ہی نمایاں اُس کی شخصیت ہوگی، وہ کامل حُسن کے دیدار کے لیے تڑپتا رہے گا اور یہ دیدار اُسے نصیب ہوا تو وہ اُس کے کام کو کامل حسن کا نمونہ بنا دے گی! ایسے ادیب کو حقیقت کی تلاش ہوگی

اور وہ چاہے گا کہ اس کا ہر کام حق کی جستجو میں اُسے ایک
ایک قدم آگے لے جائے۔ وہ یہ کبھی تصوّر ہی نہ کر سکے گا
کہ انسانی زندگی معنیٰ اور مقصد سے خالی ہو سکتی ہے۔ وہ
ظاہری باتوں سے دھوکا نہ کھائے گا، حقیقت نگاری کے
بہانے سے حالات کی لاحاصل عکّاسی نہ کرے گا، اور
رومانیت کو اپنا مسلک بنا کر جذبات کو آوارہ نہ چھوڑ دیگا۔
اُسے اپنی خامیوں کا، اپنے علم کی کمی کا ایسا احساس ہوگا
کہ وہ رہنما بننے کا حوصلہ نہ کرے گا۔ مگر اُسے اپنے اوپر
اتنا قابو ہوگا کہ خامی اور کمی کا احساس فاسد مادّہ بن کر
اُس کی طبیعت میں بگاڑ نہ پیدا کر سکے، اُس کے دل میں
فن کی عزت ہوگی اور اُس جماعت سے محبّت ہوگی جس کی
گود میں اس فن نے پرورش پائی ہے۔ جماعت کی دُنیا

اُس کی دُنیا ہوگی اور وہ جانتا ہوگا کہ اس دنیا سے الگ اور باہر اس کا وجود محض فرضی ہے۔ جماعت کا دین اس کا دین ہوگا، اور وہ جانتا ہوگا کہ جس نے اس دین کو چھوڑا وہ اگر پیغمبر نہ ہوا تو شیطان بن جائے گا۔

ادیب کو حقیقت کا علم دنیا کو دیکھ کر نہیں ہو سکتا اور اس کی نظر دنیا ہی پر نہ ہونا چاہیے۔ اس کے لئے خلوص، سچائی، دیانت، ہمّت ضروری ہیں مگر کافی نہیں۔ انسانی سیرت کا علم بھی، خواہ وہ کتنا ہی گہرا اور مکمّل کیوں نہ ہو، ادیب کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے کہ انسان کی قدر معین اور معلوم نہیں، اس کی شخصیت ایک حالت پر قائم نہیں رہتی، اور ادیب کی نظر میں صرف کسی ایک وقت کی کیفیت ہوئی تو اس کے تصوّرات

اور اس کے سارے کام ناقص رہیں گے! اوپر کی تسلّی اس کے فن اور اس کی شخصیت کی تکمیل کے لئے لازمی ہو کہ جس طرح اُس نے اپنی جماعت کی زبان کو اور اس کے ادب کو قبول کیا ہو اسی طرح وہ اپنی جماعت کے عقاید کو قبول کرے اور اُسے یقین ہو کہ ان عقاید پر جیسا کہ چاہیئے عمل کیا گیا تو انسانی زندگی کے ابدی مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ ادیب کی طبیعت جو انسانی فطرت کو سمجھنے اور پرکھنے کی خاص صلاحیت رکھتی ہو، جھوٹ اور ریاکاری کو دور سے پہچان لیتی ہو۔ جذبات کی کشمکش جو بے شمار کیفیتیں پیدا کرتی ہو، انھیں محسوس کرتی ہو اور بیان کر سکتی ہو، کبھی اسے گوارا نہ کرے گی کہ وہ ایسے عقاید کو زبان سے صحیح کہے جنھیں وہ دل میں غلط سمجھتا ہو۔

اس لیئے وہ اپنی جماعت کے اور اپنے عقاید کی اُس طریقے پر جانچ کرے گا جو اُسے آتا ہے اور جماعت پر یہ واضح کرے گا کہ وہ اپنے اصل نمونے سے کس قدر مختلف ہو گئی ہے لیکن آدھی بات کہنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کہا جائے آدھے رستے تک لے جا کر چھوڑ دینے سے بہتر ہے کہ رہنمائی کا دعوی نہ کیا جائے۔ ایسا ادیب اچھا ہو سکتا ہے جو زندگی کا دلچسپ پہلو دیکھے اور دکھائے، مایوسی اور رنج کو ہنسا کر یا جی بہلا کر دور کرے، لیکن اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں بس اسی کی صلاحیت ہے! ایسا ادیب بھی اچھا ہو سکتا ہے جو زندگی کے طریقے کا مانے ہوئے اخلاقی اصولوں سے مقابلہ کرے اور اپنی جماعت کے افراد کو اخلاقی نمونوں کی حیثیت سے پیش کرے اور جانچے۔ اس طرح

وہ نفسِ انسانی کا علم عام کرکے طبیعتوں میں گہرائی، تخیّل میں
وسعت اور برتاؤ میں رواداری پیدا کر سکتا ہے، مگر یہیں سے
اس کی دشواریاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے لئے
خالی اصول معیار کا کام نہیں دے سکتے۔ وہ منطقی یا فلسفی
نہیں ہوتا جیسے مصوّر رنگوں اور سنگتراش پتھّر کے بغیر معذور
ہو جاتا ہے۔ ادیب بھی عقیدے اور اصول کو سمجھ نہیں سکتا
جب تک کہ وہ ان جیتی جاگتی ہستیوں میں مُتشکّل نہ ہو جو اس
کی نظر اور دل میں سمائی رہتی ہیں۔ سچّا ادیب اس منزل
پر پہنچ کر بیٹھ نہیں جاتا اور واپسی کا ارادہ نہیں کرتا جیسے زبان
کو سیکھتے وقت اُس نے ان صفات کو جم کر مان لیا تھا جو خود
اس میں موجود نہ تھیں اور پھر آہستہ آہستہ انھیں اپنے اندر
پیدا کیا تھا ویسے ہی اس مقام پر وہ اس تعلیم کو جو وجدانی یا

الہامی علم کی بنا پر دی جاتی ہے صحیح مان کر اپنے فن کو اس کا
رازداں اور حامل بناتا ہے ۔ رہنمائی وہ اب بھی نہیں کرتا ، یہ
اس کا منصب نہیں ۔ لیکن وہ انسان اور اس کی دنیا کو
لاوارث نہیں سمجھتا ۔ وہ جانتا ہے کہ جیسا رشتہ اُس نے
اپنے معبود سے قایم کیا ہے ویسا ہی رشتہ ہر انسان قایم کر سکتا
ہے ، اور انسان اور اس کی زندگی کی تکمیل یقینی ہے ۔ وہ چاہتا
ہے کہ انسان اس حقیقت پر دل سے بھروسا کرے اور اس
کے جذبات کا سارا کھیل ، کائنات کا سارا کاروبار ایک
پراسرار عبادت بن جائے !
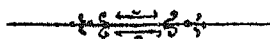
مجیب صاحب کی دوسری کتابیں

روسی ادب روسی ادب کی تاریخ اور خصوصیات، انسانی نفسیات اور جدّوجہد کا مرقع۔ مفید کارآمد کتاب۔ مجلد قیمت ۵ عہ

دنیا کی کہانی۔ دنیا کی ہزاروں برس کی تاریخ۔ دلچسپ اور دلنشین پیرائے میں قیمت ۱۲/

کیمیاگر۔ مختصر شمالی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۱/عہ

کھیتی۔ دلچسپ افسانوں کے پیرائے میں بصیرت افروز حقائق۔ ۶/

انجام۔ ایک دلچسپ و معنی خیز ڈراما۔ قیمت ۶/

شبدلا۔ بچوں کے لئے روسی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ ۳/

دوسری دلچسپ کتابیں

ذکر حسین۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی وہ تقریر جو "یادگار حسینی" کی تقریب میں پڑھی گئی تھی۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ۴/

حالی محبّ وطن۔ ڈاکٹر صاحب کی وہ تقریر جو "حالی صدی" پر پڑھی گئی اور بے حد پسند کی گئی، مع فوٹو مولانا حالی مرحوم۔ قیمت ۶/

بچوں کے ادیب مجتبیٰ صاحب

کی کتابیں تمام ملک میں مشہور ہیں

بچے اور بوڑھے، اور بڑے بڑے ادیب اور تعلیمات کے ماہر مجتبیٰ صاحب کے طرز تحریر کو بے حد پسند کرتے ہیں۔

الف لیلہ کے افسانے

مجتبیٰ صاحب نے خاص کر بچوں اور بالغ مبتدیوں کیلئے الف لیلہ کی کہانیاں بہت سلیقے سے لکھی ہیں

گلنار بیگم ۔ اُن کا پہلا حصہ ہے۔ قیمت ۸ع

حرکت میں برکت ۔ یہ الف لیلہ کی کہانیوں کا دوسرا حصہ ہے ۸ع

مرجینا ۔ الف لیلہ کی کہانیوں کا تیسرا حصہ۔ قیمت صرف عہ/

دروانہ ۔ الف لیلہ کے طرز پر جرمن ادیب ولیم ہاف کی لکھی ہوئی کہانیاں مجتبیٰ صاحب کی زبان میں، بہت دلچسپ، بہت سی تصویریں، خوبصورت چھپائی۔ قیمت صرف ۸/

ملنے کا پتہ: اُردو گھر (رجسٹرڈ) دہلی۔ کلاں محل

ناشر
اُردو گھر دہلی
احمد منزل کلاں محل